© rasailojaraid.com

از حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ

فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید — تقاضے اور راہِ عمل

اسلامی علوم و افکار کی تشکیل جدید اور بہ جہت اجتہاد کی ضرورت پر علمی حلقوں میں بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے اسی سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی رحمہ اللہ تعالیٰ کا بیش قیمت علمی مقالہ پیش کیا جا رہا ہے

۲۹ دسمبر ۱۹۷۵ء کو ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ایک غیر معمولی اور عظیم اجلاس میں شرکت ہوئی جس کا موضوع تھا فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ۔ اس اجلاس میں ملک کے تمام مرکزی اداروں کے نمائندوں اور تقریباً ہر مکتب خیال کے فضلاء اور دانشوروں نے شرکت کی۔ اجلاس کی اہمیت صدر جمہوریہ ہند عالی جناب فخر الدین علی احمد کی شرکت سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔ احقر ناکارہ کو صدر اجلاس منتخب کیا گیا۔ چونکہ صدر مملکت نے صرف ایک گھنٹہ دیا تھا۔ اس لیے اجلاس کی پہلی نشست کی ساری کارروائی ایک ہی گھنٹہ میں پوری کی جانی ضروری تھی۔ ابتداء میں شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور اس کے بعد محترم ضیاء الحسن صاحب فاروقی پرنسپل جامعہ کالج و ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ نے اجلاس کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ پندرہ پندرہ منٹ صدر جلسہ اور صدر مملکت کی تقریروں کے لیے تھے۔ احقر نے اولاً اپنی تقریر سے جلسہ کا افتتاح کیا۔ لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے چونکہ اس اہم موضوع پر کوئی تفصیلی روشنی ڈالنا ممکن نہ تھا اس لیے تقریر میں چند بنیادی اور اساسی نقاط ہی بیان کئے جا سکے۔ البتہ نشست کے اختتام پر جب اس کا ذکر آیا تو ذمہ داران جامعہ نے اسے مناسب خیال فرمایا کہ یہ تفصیلات نقاط مقالہ کے طور پر لکھ کر ارسال کر دی جائیں جس میں باقیماندہ نقاط بحث بھی شامل ہوں۔ اس لیے یہ مقالہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں وہ سب بنیادی بھی ہیں جو اجلاس میں زبانی بیان کی گئی تھیں اور باقیماندہ نقاط بھی آگئے ہیں جو وہاں بیان میں نہ آ سکتے تھے ممکن ہے کہ ترتیب میں فرق ہو لیکن مقاصد سب آگئے ہیں۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس موضوع کے سلسلہ میں چند بنیادی نقاط پیش کر دوں جنہیں فکر جدید کی تعمیر اٹھانے والے حضرات کو پیش نظر رکھنا میرے نزدیک از بس ضروری ہے۔

عالم بشریت میں فکر و تفکر کی اہمیت

پہلے بطور تمہید کے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ عالم بشریت میں فکر و تفکر ایسی ایک عظیم اصول بلکہ اصل الاصول قوت ہے کہ انسان کی ساری معنوی قوتیں اسی کے نیچے آ کر ابھرتی ہیں۔ اور سب اسی کی دست نگر ہیں، جو بلا فکر ایک قدم بھی کسی میدان میں آگے نہیں بڑھ سکتیں، حواس خمسہ ہوں یا عقل و دانش، ذوق و وجدان ہو یا بصیرت و تفقہ، حدس و تجربہ ہو یا تجربہ و قیاس ان سب کا قائد اور محرک فکر ہی ہے۔ پھر یہ فکر نہ صرف یہ کہ انسان کی تمام معنوی قوتوں کا سرچشمہ ہی ہے، بلکہ خود انسان کی ایک ایسی امتیازی خصوصیت بھی ہے جس سے اس کی انسانیت پہچانی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ قوت انسان کے دوسرے ابنائے جنس کو میسر نہیں، اس لیے اگر اس فکری قوت کو انسان کی ماہیت کا حقیقی معرف کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

انسان کی مشہور و معروف تعریف حیوان ناطق یا حیوان عاقل سے کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاتی ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو اس سے انسان کا کوئی امتیاز بخش تعارف نہیں ہوتا کہ اسے انسان کی حد تام یا جامع و مانع تعریف سمجھ لیا جائے۔ کیونکہ عقل کا تھوڑا بہت جوہر غیر انسان حتیٰ کہ حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے۔ ایک کتے کو بھی اگر ایک جگہ ٹکڑا ڈال دیا جائے تو اگلے دن وہ پھر اسی جگہ آموجود ہوگا۔ گویا وہ قیاس کرتا ہے کہ جب آج اسی جگہ ٹکڑا ملا ہے تو کل کو بھی مل سکتا ہے اور جب مل سکتا ہے تو پھر اسی جگہ پہنچ جانا چاہیے، یہ مقدمہ کی کڑی ملانا آخر عقل قیاس نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ خواہ وہ تعبیری اور مفصل نہ ہو مگر ایک حقیقت تو ہے نیز عرف عام میں بعض جانوروں کو چالاک اور ہوشیار کہا جاتا ہے۔ جیسے لومڑی اور گدھے جیسے کو عام طور سے احمق اور بلید کہتے ہیں، سعدی شیرازی نے کہا تھا کہ

مسکین خر اگرچہ بے تمیز است

چوں بار ہمی برد عزیز است

اور کسی نے بھینس کے بارے میں بھی کہا ہے کہ

جاموش بے وقوف و بے ہوش

چوں شیر دہد ز چشم اندر پوش

اگر ان حیوانات میں عقل و شعور کی جنس ہی نہ ہوتی تو یہ ذہنی تفاوت کی تقسیم صحیح نہ ہوتی جو عرف عام میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے، اندریں صورت عاقلیت یا دریافت معقولات علم الاخلاق انسان کی خصوصیت قرار دے کر اس کی حد تام حیوان ناطق کو بتلایا جانا اور اس سے نوع انسانی کا تعارف کرایا جانا کوئی جامع مانع قسم کا تعارف نہیں ہو سکتا، البتہ فکر و تدبر کے ملتے سے حقائق کا تجزیہ کر کے ان میں امتیاز قائم کرنا، نئے نئے انکشافات سے جزئیات پیدا کر لینا اور جزئیات کو جمع کر کے ان سے کلیات بنانا، کلیات سے جزئیات کا نکال لینا اور جزئیات کے عواقب و نتائج کو سمجھنا، نتائج کے معیار سے عواقب اور انجام دنیا و آخرت کو پیش نظر رکھنا، نوعی خیر سگالی اور اس کی منظم تدبیریں اور اصلاح معاشرہ کے لیے سوچ بچار و غیرہ بلا شبہ انسانی نوع ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ سب اسی فکر کے کرشمے ہیں۔ اسی لیے انسانی حقیقت کی اگر کوئی جامع مانع تعریف ہو سکتی ہے تو وہ حیوان ناطق نہیں بلکہ حیوان متفکر ہو سکتی ہے کیونکہ فکر مندی، فکر نمائی، اور فکری پیمائش اور وہ بھی عمومی اور ہمہ گیری نوع البشری کے لیے اور نہ صرف اسی حیات کے لیے بلکہ حیات مابعد الممات تک کے لیے صرف انسان ہی کی خصوصیت ہے، جو اس کے دوسرے ابنائے جنس کو میسر نہیں۔ اسی لیے حیوان متفکر ہی کو انسان کی حد تام تک کہنا کچھ زیادہ قرین عقل نظر آتا ہے۔

پس یہ فکری قوت ہی انسان کی سب سے بڑی فعال قوت اور اس کی ساری معنوی قوتوں میں اُولوالامر کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی وہ طاقت ہے جس سے وہ کائنات میں متصرف اور ہر عنصری مخلوق سے اونچا سمجھا جاتا ہے۔ پھر یہی نہیں کہ انسان اسی قوت کا ایک ظرف ہی ہے جس میں عقل و دانش، ذوق و وجدان اور حواس و تجربہ جیسی قوتوں کی مانند فکر بھی ان ہی جیسی ایک قوت ہے اور دوسری قوتوں کی طرح وہ بھی کسی خاص وقت اپنے محدود و مخصوص دائرے میں کام دے جاتی ہے، بلکہ فکری طاقت اس کی تمام معنوی طاقتوں پر حکمران، متصرف اور ان کی روح ہے۔ جس کے اشاروں پر یہ ساری قوتیں آمادہ عمل رہتی ہیں۔ اگر کہیں نمائش کروفر کا بازار گرم ہو اور باجوں، گاجوں اور نعروں کی آوازیں فضا میں گونج رہی ہوں، لیکن اگر راہ گیر کسی دوسرے خیال میں مستغرق ہو تو ان میں سے ایک چیز بھی نہ آنکھ کو نظر آئے گی نہ کان کوئی آواز سن پائے گا۔ اور لاعلمی کے اظہار پر جب لوگ حیرت کریں گے تو وہ یہ کہے گا کہ میں فلاں بات کے فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے ان مناظر اور آوازوں کی کچھ خبر نہیں، اس سے واضح ہے کہ آنکھ کان نہ خود دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں بلکہ قوت خیال و فکر ہی دیکھتی سنتی ہے یہ آنکھ کی بینائی اور کان کی شنوائی فکر کے آلات و وسائل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

یہی حکمت عقل و دور اندیشی کی بھی ہے کہ آدمی زیرک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی ہو اور دانائے روزگار بھی سمجھا جاتا ہو لیکن وہ کسی تجربے کی سوچ میں محو ہو تو دوسرے کتنے ہی عقلی تجربات اس کے سامنے رکھ دیئے جائیں نہ وہ انہیں سمجھ سکے گا نہ ان کا شعور ہی پا سکے گا۔ کیونکہ اس کی قوت فکر یہ کسی دوسرے میں مصروف جولانی ہے اور فکر کو فرصت نہیں ہے کہ وہ اس تجربے پر غور کر سکے۔ اسی طرح روحانی احوال و کیفیات کا ادراک بھی قوت فکریہ کے بغیر وجود پذیر نہیں ہو سکتا۔ اگر علمی میدانوں میں فکر کی قوت متوجہ ہی نہ ہو یا کسی دوسرے روحانی مقام میں محو ہو تو دوسرے غیبی اور وجدانی لطیفے قلب پر بھی منکشف نہیں ہو سکیں گے۔ آخر مراقبات میں قوت فکر اور دھیان ہی کا تو استعمال ہوتا ہے احسان یا تصوف کے معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ کو اس طرح حاضر و ناظر تصور کر کے آدمی عبادت میں مصروف ہو گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ سو یہ قوت فکر کا استعمال نہیں تو اور کیا ہے!

انسان کی فکری قوت کی کارپردازی

بہرحال یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ انسان کی صنعت میں حقیقی کارپرداز صرف یہ فکری قوت ہے۔ وہ نہ متوجہ ہو تو قوت باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ اور قوت عاقلہ سب معطل رہ جاتی ہیں۔ اس لیے جب وہ محسوسات کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو حواس خمسہ ہرکاروں کی طرح اس کے حکم پر دوڑتے ہیں۔ جب معقولات کی طرف منعطف ہوتی ہے تو عقل ایک خادم کی طرح اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔ یہی قوت فکر جب غیبیات کی طرف چل نکلتی ہے تو وجدان و ذوق اس کے اشاروں پر کام کرتے ہیں۔

اس لیے قوت فکریہ نہ صرف یہ کہ انسان کی خصوصیت ہی ہے جو اس کی ماہیت کا سرنامہ ہے بلکہ اس کی ساری ہی اندرونی قوتوں کی روح اور ان کے حق میں محرک اور قائد بھی ہے۔ قرآن حکیم نے اپنے کلام معجز نظام میں اسی حقیقت کو واشگاف فرمایا ہے۔ چنانچہ جو قومیں ان حسی طاقتوں، آنکھ کی بینائی اور کان کی شنوائی وغیرہ کے ذریعہ معجزات انبیاء کو دیکھتی تھیں اور ان کے پاک کلمات سنتی تھیں، مگر رضا و تسلیم کا نام نہیں لیتی تھیں تو قرآن حکیم نے اس کی وجہ آنکھوں کی نابینائی یا کانوں کی ناشنوائی قرار نہیں دی بلکہ دل کی نابینائی بتلائی ہے جو درحقیقت اسی قوت فکریہ کی نابینائی ہے ارشاد ربانی ہے:

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ

(بات یہ ہے کہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں بلکہ سینوں میں دل اندھے ہیں۔ جو فکر اور غور سے عاری ہیں)۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حواس کی روح اور مدار کار فکر قلب ہی ہے نہ کہ نظر چشم۔ فکر کی آنکھ نہ ہو تو حواس سب کے سب اندھے ہی رہ جاتے ہیں گو وہ طبعی آمادگی سے دید و شنید کا کام بھی انجام دیئے جائیں۔ اسی لیے قرآن حکیم نے منکرین کی ظاہری دید و شنید کو مانتے ہوئے بھی اس کی حقیقی کارکردگی کا انکار کیا ہے جبکہ اس کی غرض و غایت ہی اس پر مرتب نہیں ہوتی جو قوت فکر سے متعلق ہے کہ یہی فکری روح ان محسوسات کے پیکروں میں سے اگلی روح نکال کر لاتی ہے۔ ارشاد حق ہے:

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ أَفَأَنتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ وَمِنْهُم مَّن يَنظُرُ إِلَيْكَ أَفَأَنتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ۔

"اور آپ ان کے ایمان کی توقع چھوڑ دیجیے کیونکہ) ان میں (گو) بعض ایسے بھی ہیں جو (ظاہر میں) آپ کی طرف کان لگا لگا کر بیٹھے ہیں۔ کیا آپ بہروں کو سنا کر ان کے ماننے کا انتظار کرتے ہیں گو ان کو کچھ بھی نہ ہو اور اسی طرح ان میں بعض ایسے ہیں کہ (ظاہرا) آپ کو (مع معجزات و کمالات) دیکھ رہے ہیں تو پھر کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھلانا چاہتے ہیں گو ان کو بصیرت بھی نہ ہو"۔

اس سے واضح ہے کہ سن کر کسی چیز کو ان سنی کر دینا اور دیکھ کر ان دیکھی بنا دینا قوت فکری کے تعطل سے ہوتا ہے جس کو قرآن نے عقل و ابصار سے تعلق ہو تو وہ مبصر و مستمع بلحاظ حقیقت غیر مسموع اور غیر مبصر کے حکم میں ہے۔ پھر اسی طرح قرآن حکیم نے ایک دوسری جگہ ان منکروں کے حق میں فرمایا جو مہر علیہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام اور ان کے پیغمبر کے اقوال و افعال کو دیکھتے اور سنتے تھے اور جس انداز سے وہ بینا اور شنوا بھی تھے لیکن فکر قلبی نہ ہونے یا نہ برتنے سے ان کے یہ حواس حیوانی حواس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے، اور ان میں وہ فکری شعور نہ تھا جو حقیقت حق کو دیکھتا اور سنتا ہے جسے قرآن نے تفقہ قلبی سے تعبیر کیا ہے، ارشاد حق ہے

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ
أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ
لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ
بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولٰئِكَ هُمُ
الْغَافِلُوْنَ ۔

"ان کے دل ایسے ہیں کہ جن سے وہ سمجھتے نہیں ان کی آنکھیں ایسی ہیں کہ جن سے وہ دیکھتے نہیں ان کے کان ایسے ہیں کہ جن سے وہ سنتے نہیں ایسے لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں یہی لوگ غافل ہیں۔"

اس سے واضح ہے کہ قلب کا محض طبعی شعور اصل نہیں جو حیوانات میں بھی موجود ہے بلکہ تفقہ قلب اصل ہے، جس کا دوسرا نام قوت فکر ہے، وہ نہ تو حواس کام ہی نہ کریں گے یا کریں گے تو وہ ناقابل اعتبار ہوگا اور غیر قابل التفات جس سے نمایاں ہے کہ قلبی نور اصل ہے جس کا نام فکر ہے نہ کہ مطلقاً قلبی شعور جو چوپایوں میں پایا جاتا ہے۔

عقل کی کارگزاری کے قابل التفات ہونے کا حقیقی معیار

اسی طرح عقل کے بارے میں بھی قرآن کریم نے یہی فیصلہ دیا ہے کہ اس کی کارگزاری کے قابل التفات ہونے کا معیار بھی قوت فکر ہے۔ عقل محض نہیں، یعنی عقل طبعی کے سوچ بچار کے باوجود جبکہ قلب کا فقہی سوچ بچار اس کا منشا نہ ہو جس کا نام فکر ہے تو عقل شعور بھی بے شعور اور ناقابل اعتنا ہو جاتا ہے، چنانچہ ایسے قلوب کو جو بے فکرے ہوں۔ قرآن نے انہیں عاقل نہیں کہا غافل کہا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَمِنْ اٰيَاتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا
وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُحْيِيْ بِهِ
الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۔

"اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی دکھاتا ہے جس سے ڈر بھی ہوتا ہے اور امید بھی ہوتی ہے اور وہی آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے، ان میں سے ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔"

اس آیت کریمہ سے نمایاں ہے کہ برق و بخار اور بارش سے احیاء غبار (زمین) وغیرہ باوجودیکہ آنکھوں سے نظر آنے کی چیزیں ہیں جنہیں سب دیکھتے ہیں حتی کہ چرند و پرند بھی، اور ان سے اس دنیوی زندگی کے بارے میں کچھ نہ کچھ خوف و طمع کا اثر بھی لیتے ہیں، لیکن فرمایا یہ گیا ہے کہ ان حوادث میں قدرت کی نشانیاں پنہاں ہیں، اور ان ہی کی پہچان کرانا مقصود بھی ہے۔ وہ صرف عقل لڑانے والوں ہی کے لیے ہیں آنکھ لڑانے والوں کے لیے نہیں۔ اور عقل لڑانے کا نام ہی فکر کا استعمال ہے جو عقل کو کام پر لگاتا ہے۔ بے فکری اور بے توجہی سے عقل تنگ و نارسا بھی عبث اور بے نتیجہ رہ جاتی ہے۔ بہر حال حس ہو یا عقل، ذوق ہو یا وجدان بلا فکر کے نابینا اور بے نگاہ سمجھے گئے ہیں۔ جس سے فکر کا بلند مقام کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

قرآن حکیم کی انسان کو فکر و تدبر کی دعوت اور اس کا انداز

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جگہ جگہ مختلف دائروں میں انسان کو فکر و تدبر کی دعوت دی ہے کہیں غور و فکر کے لیے انفس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آیات کہیں شرعی اور عقلی آیات سامنے رکھی ہیں اور کہیں وجدانی اور لدُنی آیات اور ان میں تدبّر اور غور و فکر کا مطالبہ کیا ہے۔ انفسی آیات کی طرف رہنمائی کے لیے فرمایا:

وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ

تمہارے اندر (خود دلائل معرفت) موجود ہیں کیا تم غور نہیں کرو گے!

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِیْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

کیا وہ آسمانوں اور زمین کے حقائق میں نظر و فکر نہیں کرتے!

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ

ہم عنقریب ان کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں ان کے گرد و نواح میں بھی دکھا دیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ قرآن حق ہے"

کہیں شرعی آیات پیش کیں اور قرآن حکیم کو غور و تدبر کے لیے پیش کیا:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا

کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے"

کہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی حیات طیبہ کی شانوں اور پاکیزہ سیرت و کردار میں غور کرنے کی طرف توجہ دلائی۔۔۔ تاکہ اس سیرت پاک کو دیکھ کر آپ کی دعوت کی صداقت دلوں میں آجائے اور لوگ اسے ماننے کے لیے تیار ہو جائیں، فرمایا:

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۣ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ الی آخرہ۔۔ عَذَابٍ شَدِيْدٍ۔

"آپ فرما دیں اے پیغمبرؐ کہ میں تمہیں ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم دو دو اور فرادی فرادی اٹھو اور پھر فکر کرو کہ کیا واقعی تمہارے ان ساتھی (پیغمبرؐ) میں کوئی دیوانگی یا جنون ہے! وہ تو اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ تمہیں آخرت کے شدید عذاب سے ڈرانے والے ہیں جو تمہارے سامنے آنے والا ہے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۔

کیا یہ فکر سے کام نہیں لیتے اپنے ساتھی (پیغمبرؐ) کے بارے میں کہ کیا ان میں جنون ہے! وہ نہیں ہیں مگر ایک کھلے ہوئے ڈرانے والے آخرت کے عذاب سے کیا یہ کسی مجنون کا کام ہے!

یہی صورت وجدانیات کی بھی ہے کہ حقائق غیبیہ کے انکشاف میں بھی یہی قلبی فکر کام کرتا ہے جس کو "لُب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا کہ:

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ

"جسے حکمت دے دی گئی اسے خیر کثیر عطا کر دی گئی اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو گہری عقل والے ہیں"

حاصل کلام

حاصل یہ ہے کہ مطلقاً عقل ایک طبعی غریزہ اور طبعی مادہ ہے، جیسے بینائی اور شنوائی وغیرہ اگر وہ صورت عقل ہے جو مادہ شعور ہے اور زیادہ سے زیادہ قیاس کے راستے سے کلیات کا ادراک کر لیتا ہے لیکن لُب اور اَلباب حقیقتاً عقل ہی جس سے حقائق کونیہ اور حقائق شرعیہ منکشف ہوتی ہیں۔ اسی کا نام فکر ہے۔ یہ حکمت ہے خیر کثیر کہا گیا ہے۔ محض عقل طبعی سے برآمد نہیں ہوتی، بلکہ عقل عرفانی سے منکشف ہوتی ہیں جسے لُب کہا گیا ہے۔

بہرحال قرآن حکیم نے اسی خاص قوت فکر کو جس کا تعلق خواہ معرفت خداوندی، حقائق نبوت اور اس کے ایمان کے انکشاف سے ہے جسے حکمۃ اللہ کہا گیا ہے۔ اسی کو کہیں فقہ قلبی سے کہیں لُب (عرفانی) کہیں نظر (باطن) سے کہیں بصیرت سے اور [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

من اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے جو انسان کی ساری قوتوں، حواس عقل وجدان عقل اور حدس و تجربے کو کام میں لگاتا ہے۔ اور یہ صرف انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

بہر حال قرآن حکیم نے فکر کو انسان کا بنیادی جوہر قرار دے کر اس کا مصرف انفس و آفاق تشریع و تکوین اور کمالات ذات و صفات نبوی اور معرفت الٰہی کو بتلایا ہے اور جگہ جگہ اس کی دعوت دی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ تفکر و تدبر چشم بینا اور گوش شنوا کا کام نہیں، بلکہ قلب متفکر ہی کا کام ہے، اور فکر ہی جب ان اعضاء حواس وغیرہ کا امام بنتا ہے تو وہ اس کی اقتداء میں اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں، اور پھر فکر ان میں سے اصول اکل اور علل مقاصد تک پہنچ کر معرفت حق کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ یہ کہ فکر ہی انسان کی امتیازی صفت ہے۔ فکر ہی انسانی حقیقت کی فصل ممیز ہے فکر ہی سے علم و معرفت کے دروازے کھلتے ہیں، فکر ہی انسان کی ظاہری اور باطنی قوتوں کا امام اور سربراہ ہے۔ اگر فکر اسلام میں مطلوب نہ ہوتا تو اجتہاد کا دروازہ کلیۃً مسدود ہو جاتا اور فراغ فرعیہ اُمت کے سامنے نہ آسکتیں۔ یہ بحث الگ ہے کہ کس درجہ کا اجتہاد باقی ہے اور کس درجہ کا ختم ہو چکا ہے، مگر اجتہاد کی جنس بہر حال امت میں قائم رکھی گئی ہے جو برابر قائم رہے گی۔ اس لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے اگر اس بنیادی اصول بلکہ اصل الاصول کی طرف ہندوستان کے علمی حلقوں کی توجہ دلائی اور دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی دعوت دی اور ارباب علم و فضل کو انسانی اور ربانی حقائق کے انکشافات کی طرف متوجہ کیا تو نہ صرف یہ کہ اس نے ایک بڑا بنیادی مسئلہ اٹھایا ہے، بلکہ خود جامعہ کی تاریخ کو بھی دہرایا ہے، کیونکہ جامعہ کی بنیاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ نے رکھی تھی جس کا نصب العین ہی قدیم و جدید تعلیم کو یکجا کر کے ملت کی مختلف صلاحیتوں کو ایک مرکز پر جمع کر دینا تھا تاکہ فکر واحد کے راستے سے قوم کے ان دو گروہوں میں قدیم و جدید کی دوئی ختم کر کے انہیں افکار و خیالات اور عقائد و مقاصد کی وحدت سے قوم واحد بنا دیا جائے۔ اس لیے بلاشبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اس اقدام میں تبریک و تحسین کی مستحق ہے لیکن اس نئی نہضت اور فکر اسلامی کی تشکیل نو کے جذبات سامنے آنے پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس فکر کا عملی آغاز کس مرکزی نقطہ سے کیا جائے جس میں یہ تمام مذکورہ انواع جن کے لیے قرآن حکیم نے دعوت دی ہے سمٹ کر اس مرکزی نقطہ کے نیچے جمع ہو جائیں اور ہر کام بجائے پھیلنے کے سمٹ کر اس بنیادی نقطہ سے شروع ہو۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مرکزی نقطہ۔ منہاج نبوت

اس لیے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے سلسلے میں پہلا قدم جو ہمیں اٹھانا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے فکر کے لیے سب سے پہلا فکر ایک نشانہ اور ہدف متعین کر لینا چاہیے جس پر ہم اپنے فکر کی توانائیاں صرف کریں، اور شاخ در شاخ مسائل اس نقطے سے جوڑتے چلے جائیں جس سے نہ صرف راستہ ہی سامنے آجائے گا بلکہ تشتت افزا اوہام و خیالات بھی خود بخود اس سے دفع ہوتے چلے جائیں گے اور ہمارا قدم بجائے منفی ہونے کے مثبت انداز سے آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ سو ہمارے نزدیک وہ جامع نقطہ ایک ہی ہے جس کا نام منہاج نبوۃ ہے۔ جس پر فکر کو مرکز کر دینے کی ضرورت ہے کیونکہ اس منہاج ہی کی شمع ہاتھ میں لے کر یہ قوم آگے بڑھی ہے اور ظلمتوں میں اجالا پھیلتا چلا گیا ہے۔ پس اس منہاج سے آج بھی آگے بڑھ سکتی ہیں اس منہاج نبوۃ کو سامنے رکھ کر ہمارے سامنے وہ مزاج آجائے گا جو اس اُمت میں بنی اُمت نے پیدا فرمایا ہے۔ اور یہ واضح ہو جائے گا کہ خود اسلام کی تشکیل کا آغاز کس نوعیت سے ہوا کہ ہم اس کے فکر جدید کا آغاز بھی اس نوعیت سے کریں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نیز یہ بھی سامنے آجائے گا کہ اس کے ابتدائی مراحل سے گزر کر اور آخر کار اپنی انتہائی منزل پر پہنچ کر بحیثیت مجموعی اس امت کا مزاج کیسا بنایا — ؟ اور اسے کس ذوق پر ڈھالا۔

منہاج نبوۃ کا امت کے مزاج اور ذوق کی تعمیر پر اثر

غور کیا جائے تو اس منہاج نبوۃ نے اصولی طور پر ہمیں دین کے بارے میں کمال اعتدال اور توسط کا راستہ دکھایا ہے۔ نہ تو اس نے ہمیں رہبانیت کے راستے پر ڈالا کہ ہم عبادت اور دین داری کے نام پر دنیا کو کلیۃً ترک کر کے زاویہ نشیں ہو جائیں۔ شہری آبادیوں، تمدنی معاملات اور مدنیت کے سارے تقاضوں بلکہ خود اپنے سارے طبعی جذبات و میلانات کو بھی چھوڑ کر پہاڑوں اور غاروں میں جا بیٹھیں کہ نہ گھر ہو نہ در، نہ معاشرہ ہو نہ معیشت، نہ انسانی روابط ہوں، نہ قومی تعلقات، نہ موانست باہمی ہو، نہ اجتماعیت، کہ یہ نہ اسلام کا مزاج ہے نہ اس کا مطالبہ اور نہ ہی فطرۃ کا تقاضا۔ اس لیے اسلام نے اس کا نام رہبانیت رکھ کر اس کی برملا نفی کی ہے کہ:

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ

"اسلام میں رہبانیت کے لیے کوئی گنجائش نہیں"

اور نہ ہی ہمیں بہیمیت کے راستے پر ڈالا ہے کہ ہم مدنیت کے نام پر عبادت الٰہی اور طاعت نبوی سے بیگانہ ہو کر کلیۃً نظام دنیا سنوارنے، جاہ و مال کے خزانے بٹورنے میں لگ جائیں اور راحت طلبی اور عیش کوشی میں غرق ہو جائیں اور ہماری زندگی کا نصب العین ہی ہوس رانی، اخلاد اندوزی اور ہوائے نفس کی غلامی کے سوا دوسرا نہ ہو۔ نہ عقائد رہیں نہ عبادات، نہ فرائض رہیں نہ سنن، نہ واجبات ہوں نہ ان کی لگن، نہ قومی تربیت کا داعیہ رہے نہ صلہ رحمی اور خیر خواہی اور نہ اولاد و اقارب کا جذبہ، بلکہ دن رات بہائم نفس کی پیروی، شبانہ روز لہو و لعب، عیش و طرب، آرائش و آسائش اور نمائش و زیبائش، مالی تکاثر اور جاہی تفاخر ہی زندگی کا مشغلہ بن کر رہ جائے، سو اسے بھی اسلام نے نمائش زندگی، متاع اور غفلت یا بالفاظ مختصر بہیمیت کہہ کر اسے امت کے قومی مزاج سے خارج کر دیا ہے۔ فرمایا:

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ۔

اور دنیاوی زندگی تو کچھ بھی نہیں صرف دھوکے کا سودا ہے۔ یہ لوگ صرف دنیاوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں۔ اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں۔ اور آپ ان کو ان کے حال پر رہنے دیجیے کہ وہ کھائیں اور چین اڑائیں اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں انکو ابھی حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے"

بلکہ اس افراط و تفریط سے الگ کر کے دنیا کو ترک کرانے کی بجائے اس کی لگن کو ترک کرایا ہے اور دین کو اصل رکھنے کے ساتھ اسمیں غلو اور مبالغے سے روکا ہے یعنی ایک ایسا جامع فکر دیا ہے جس میں دنیا کے شعبوں کو زیر استعمال رکھ کر ان ہی میں سے آخرت پیدا کی ہے، چنانچہ دنیا کو کھیتی بتلایا اور آخرت کو اس کا پھل۔

اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ

حاصل یہ نکلا کہ اگر پھل ضروری ہے تو کھیتی بھی اتنی ہی ضروری ہے، اس لیے اسلام کے ہر حکم میں جہاں اجر آخرت ہے وہیں حظ دنیا بھی شامل ہے۔ مثلاً اگر مسواک میں ثواب آخرت ہے تو وہیں منہ کی خوشبو بھی پیش نظر ہے۔ اگر طیبات رزق میں بہ نیت حسن عبادت کی قوت رکھی گئی ہے وہیں کام و دہن کے ذائقے سے بھی اجتناب نہیں بتلایا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر لباس میں بہ نیت آخرت اور غیرت حیا اور ستر عورت کا تحفظ اصل ہے تو وہیں حسن دنیوی اور وقار بھی ملحوظ ہے۔ اگر ازار کو ٹخنوں سے نیچا اور زمین سے گھسٹتا ہوا رکھنے کی ممانعت سے کبر و نخوت اور جاہ پسندی کے تخیل سے بچایا ہے تو وہیں لباس کو آلودگی اور گندگی سے پاک اور صاف رکھنے کی صورت اختیار کی گئی ہے جو دنیاوی مفاد ہے۔ اگر تخت شاہی کا اصل مقصد عدل کے ساتھ تحفظ ملک، خدمت خلق اور قومی تربیت بجوابدہی آخرت اصل ہے تو وہیں اسے دنیوی وقار وعزت اور سیادت وقیادت کے حظوظ سے بھی بھرپور کیا گیا ہے۔ بہرحال آخرت کی سچی طلب کے ساتھ دنیا کا کسب واکتساب بھی لازمی رکھا گیا ہے۔ صاحب نے اس ذوق کو کس خوبی سے ادا کرتے ہوئے کہا ہے

فکرِ دنیا کن اندیشۂ عقبیٰ مگذار
تا بعقبیٰ نہ رسی دامنِ دنیا مگذار

غرض منہاج نبوت نے رہبانیت اور بہیمیت کے درمیان معتدل مزاج پر اس امت کو ڈھالا ہے جس میں طبعی جذبات بھی پامال نہ ہوں بلکہ ٹھکانے لگ جائیں اور عقلی مقاصد کی تکمیل میں بھی فرق نہ پڑے اور وہ بروئے کار آجائیں۔ اس لیے اس منہاج کے عناصر ترکیبی تہذیب نفس، تدبیر منزل، سیاست مدن، تسخیر اقالیم، تعظیم امر اللہ شفقت علی خلق اللہ، نظام عبادت اور نظام امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اسی کے ساتھ فکر آخرت اور محاسبہ اخروی کا استحضار قرار پائے اور پوری قوم کو اسی رنگ میں رنگا گیا ہے، تاکہ یہ قوم جامع دین و دنیا بن کر بجائے اس کے کہ دنیا کی اقوام کی جامد مقلد اور مقتدی بنے اسے خوددار بنا کر امام اقوام اور داعی حق وصداقت کی حیثیت دی گئی۔

جس طرح احمد مختار ہیں نبیوں میں امام
ان کی امت بھی ہے دنیا میں امام اقوام

تشکیل جدید میں آج کی ضرورت

پس آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس منہاج نبوت کو سمجھ کر فکر اسلامی کو ایک نئی ترتیب اور نئے رنگ استدلال سے آج کی زبان اور اسلوب بیان سے مرتب کیا جائے کہ حقیقی معنی میں اسلامی فکر کی یہی تشکیل جدید ہوگی اور نہ اس منہاج اور اس کے متوارث ذوق سے ذرا بھی ہٹ کر تشکیل ہوگی تو وہ تشکیل نہ ہوگی بلکہ تبدیل ہو جائے گی جو قلب موضوع ہوگا۔ اس لیے تشکیل جدید کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ مسائل ہمارے قدیم ہوں اور دلائل جدید تاکہ یہ تشکیل قائم کر کے ہم خلافت الٰہی اور نیابت نبوی کا حق ادا کر سکیں۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا یہ پہلا قدم ہے یا مرکزی نقطہ ہے جس سے ہمیں کام کا آغاز کرنا ہے اور اسی نقطہ پر اپنی تمام توانائیاں صرف کرنی ہیں۔

فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید میں اصول اور قواعد کلیہ اور ضوابط کی پابندی کی اہمیت

اس تشکیل جدید کے سلسلے میں دوسرا قدم وہ اصول اور قواعد کلیہ اور ضوابط ہیں جن کے نیچے منہاج نبوۃ کے تمام عقائد واحکام واخلاق وعبادات اور معاملات واجتماعیات وغیرہ آئے ہیں، تاکہ ہماری تشکیل جدید کا سرچشمہ وہی اصول ہوں جن سے مسائل کی تشکیل قدیم عمل میں آئی تھی اور اس طرح قدیم وجدید تشکیل میں کوئی تفاوت یا بعد اور بیگانگی رونما نہ ہوگی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اصول کلیہ سے ہٹ کر یا انہیں بدل کر یہ تشکیل اسلامی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فکر کی تشکیل نہ بن سکے گی۔

اگر ایک شخص سائنس کے فکر کو مرتب یا حل کرنے کے لیے فن طب کے اصول سے کام لینے لگے جن کا سائنس کے اصول مسئلہ اور علوم متعارفہ سے کوئی تعلق نہ ہو یا منطق و فلسفہ کی فکر کی تشکیل کے لیے صرف و نحو کے اصول سے کام لینے لگے تو وہ کبھی اس تشکیل میں کامیاب نہ ہو سکے گا، اس لیے سب سے پہلے اسلامی فکر کی تدوین و ترتیب میں اسلامی فکر کے اساسی اصول ہی کو سامنے رکھنا پڑے گا، تاکہ ہماری تشکیل سے وہ ذوق فوت نہ ہونے پائے جو ان اساسی اصول میں پیوست کیا گیا ہے۔ اور انہی سے شریعت کے قواعد و مقاصد تک پہنچا ہوا ہے۔ یہ اصول و قواعد ہی درحقیقت منہاج نبوۃ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں، جس کا اثر پورے قانون شریعت میں پھیلا ہوا ہے، اگر تشکیل جدید میں یہ قواعد و ضوابط نہ رہیں تو وہ اسلامی فکر کی تشکیل نہ ہوگی صرف دماغی فکر کی تشکیل بن جائے گی۔

اصول و ضوابط کے ساتھ جزئیات کے تعین کا مسئلہ

البتہ ان قواعد کلیہ میں جو ضوابط عبادات اور عقائد کے بارے میں ہیں ان کی عملی جزئیات بھی شریعت نے خود متعین کر دی ہیں، اس لیے ان میں تغیر و تبدل یا کسی جدید تشکیل کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ البتہ معاملاتی، معاشرتی اور سیاسی و اجتماعی امور میں چونکہ زمانے کے تغیرات سے نقشے اور نتائج بدلتے رہتے ہیں، اس لیے شریعت نے ان کے بارے میں کلیات زیادہ بیان کی ہیں اور ان کی جزئیات کی تخصیص کو وقت کے تقاضوں پر چھوڑ دیا ہے جن میں اصول و قواعد کے تحت تو شعبات ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے، البتہ ایسے تغیرات کو چونکہ قواعد کلیہ کے تحت رکھا گیا ہے۔ اس لیے ان میں بہرحال [illegible]

کی ضرورت پڑے گی، جسے معتبر علماء کی بصیرت ہی حل کر سکے گی، جیسا کہ قرون ماضیہ میں کرتی رہی ہے بس ایک مجتہد کو اجتہاد کی تو اجازت ہے ایجاد کی نہیں ہے کہ وہ اتباع کے دائرے سے باہر نہ نکل سکے۔ خواہ یہ اتباع جزئیات کا ہو جب کہ وہ منصوص ہوں یا قواعد کلیہ کا ہو جب کہ وہ اجتہادی ہوں جزئیات میں درحقیقت اتباع ان اصول اجتہاد ہی کا ہوتا ہے جس کے ذریعے یہ جزئیات باہر آتی ہیں اس لیے اس تشکیل جدید کے موقع پر یہ کلیات و جزئیات سامنے رکھنی ناگزیر ہوں گی۔ اور انہی کے دائرے میں رہ کر یہ جدید تشکیل و ترتیب عمل میں آسکے گی، نیز اگر اس تشکیل کا مقصد قومی تربیت ہے کہ افراد اس منہاج پر ڈھالے جائیں تو یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ تربیت اصول اور کلیات سے نہیں ہو سکتی جیسے علاج اصول طب اور معرفت خواص ادویہ سے نہیں ہو سکتا جب تک کہ مزاج کے جزوی احوال کو پہچان کر جزوی طور پر نسخہ تجویز کیا جائے ایسی صورت شرعیات کی بھی ہے کہ اگر قومی معالجہ اور قومی اصلاح پیش نظر ہو تو وہ محض اصول کلیہ سے نہیں ہو سکتی، بلکہ جزئیات عمل ہی سے ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن اصولوں کا عمل سے کوئی تعلق نہ ہو وہ محض ذہن کی زینت ہوں عملی زندگی سے انہیں کوئی تعلق نہ ہو، اور کوئی عملی پروگرام بھی ان کے پیچھے نہ ہو تو شریعت نے یہ پسند نہیں کیا کہ ان میں زیادہ غور و خوض کیا جائے۔ مثلاً چاند کے گھٹنے بڑھنے کے بارے میں لوگوں نے سوال کیا تو قرآن نے اسلوب حکیم پر جواب دیا کہ اس کے منافع سے فائدہ اٹھاؤ اس کے حقائق کے پیچھے مت پڑو:

يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ
مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ۔

"آپ سے چاندوں کے حالات کی تحقیقات کرتے ہیں آپ فرما دیجیے کہ وہ آلہ شناخت اوقات ہیں، لوگوں کے [illegible] کے لیے"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روح کے بارے میں سوال کیا تو فرما دیا گیا کہ تمہارا علم اتنا نہیں ہے کہ ان حقائق کو پہچان سکو تو کیوں اس ناقابل فہم بات کے پیچھے پڑتے ہو۔ یہ حقائق یا خود ہی عمل ریاضت سے منکشف ہو جائیں گی یا اگر نہ ہوں تو قیامت میں تم سے ان کا کوئی سوال نہ ہوگا کہ نجات ان پر موقوف نہیں تھی۔

قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ
مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا

"آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے"

"یا اس طرح قیامت کے وقت کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا گیا کہ تمہیں اس سے کیا تعلق تمہاری ترقی اور سعادت اس کے مقررہ وقت کے علم پر موقوف نہیں، صرف اس کے آنے کے یقین اور عقیدے پر موقوف ہے اور اس میں یہ جزوی تفصیلات شامل نہیں۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا فِيمَ أَنْتَ
مِنْ ذِكْرَاهَا إِلَىٰ رَبِّكَ مُنْتَهَاهَا۔

"یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا سو اس کے بیان کرنے سے آپ کا کیا تعلق اس کے علم تعیین کا مدار صرف آپ کے رب کی طرف ہے"

بہر حال قرآنی رہنمائی سے علم وہی مطلوب ۔۔۔ اور قابل تحصیل ہے جس سے عملی زندگی میں کوئی سدھار پیدا ہو اور سعادۃ دارین حاصل ہوتی ہو حاصل یہ ہے کہ عملی زندگی محض اصول سے نہیں بنتی بلکہ جزئیات عمل ہی سے بنتی ہے جس کی بروقت تمرین اور ٹریننگ دی جائے۔ اسی لیے کسی مربی نفس ربانی کی ضرورت ہے۔ ربانی کی تفسیر ابن عباسؓ نے اَلَّذِیْ يُرَبِّي النَّاسَ بِصِغَارِ الْعِلْمِ ثُمَّ بِكِبَارِهَا سے کی ہے یعنی ربانی وہ ہے جو ابتداءً چھوٹی چھوٹی جزئیات سے لوگوں کی تربیت کرے اس لیے قرآن کریم نے تذکیر و مواعظ اور امر بالمعروف کے نظام کو اجتماعی طور پر رسمی کیا اور اسے تمکین فی الارض (حکومت و سلطنت) کی بنیادی غرض و غایت ٹھہرایا

خلاصہ یہ ہے کہ جس منہاج پر ہم اپنی فکری توانائی صرف کریں وہ جہاں اصول ہو وہیں وہ جزئیات عمل سے بھی بھرپور ہو تاکہ علم اور عمل دونوں جمع ہو سکیں، کہ اس کے بغیر ہمارا افکار اس کی تشکیل پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔

حاصل مطلب

حاصل یہی ہوا کہ فکر اسلامی کی ترتیب کے وقت جیسے اسلامی بنیادوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے ایسے ہی فقہ اور تطبیقی جزئیات کا سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ البتہ مناسب اور آج کے دور کی نفسیات کو سامنے رکھ کر ان جزئیات میں ترجیح و انتخاب مجدابات ہے، وہ اہل علم کا کام ہے۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ اصول کا تعارف اور ان کی جامعیت وسعت نیز ان کے اندرونی مضمرات کی وضاحت ان کی جزئیات کے بغیر ممکن نہیں، نظری اصول کتنے ہی معقول اور دلپذیر ہوں لیکن جب تک ان کی عملی مثالیں سامنے نہ ہوں، ان کا حقیقی مفہوم واشگاف نہیں ہو سکتا ان جزئیات عمل ہی سے اسلام کی مجموعی اور صحیح صورت و شکل سامنے آسکتی ہے اس لیے فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں جہاں ایک طرف مجموعۂ دین کے اساسی اصول اور ان کے نیچے ہر ہر باب کے قواعد کلیہ یا ضوابط تفقہ ناگزیر ہیں وہیں دوسری طرف ان کے نیچے کی عملی جزئیات کا سامنے ہونا بھی لازمی ہے۔ ورنہ اصول کی وسعت و جامعیت کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔

فقہاء متقدمین کے استخراج جزئیات کی افادیت

اس سے ہی ان حوادث و واقعات پر بھی روشنی پڑ سکتی ہے جو ان جزئیات کے استخراج کا باعث بنے جب کہ فقہائے امت نے قواعد شرعیہ سامنے رکھ کر ان کے بعید

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے بعید محتملات کے احکام بھی ان قواعد سے نکالے گئے ہیں کہ ہر دور کے حوادث میں لازمی طور پر یکسانی ہوتی ہے۔ گو حادثوں کی شکلیں حسب زمان و مکان کچھ جدا جدا بھی ہوں، اس لیے وہی جزئیات آج کے حوادث میں بھی بیکار ثابت نہیں ہو سکتیں اور کچھ نہیں تو آج کی جزئیات کو کم از کم ان پر قیاس تو ضرور ہی کیا جا سکتا ہے، بلکہ بہت ممکن ہے کہ فقہیات میں ایسی جزئیات بکثرت مل جائیں جو آج کے دور میں سابق دور کی طرح کارآمد ثابت ہوں اور حالات کا پورا مقابلہ کر سکیں، ضرورت اگر ہوگی تو بابت وار تلاش و جستجو کی ہوگی۔ بلکہ یہ جزئیات چونکہ فقیہانہ ذہنوں سے نکلی ہوتی ہیں اس لیے بہ نسبت ہماری استخراج کردہ جزئیات کے منہاج نبوت سے زیادہ قریب ہوں گی اس لیے بجائے اس کے کہ ہم از سر نو قواعد کلیہ سے جزئیات کا استنباط کرنے کی مشقت میں پڑیں یہ زیادہ سہل ہوگا کہ استخراج شدہ جزئیات کی تلاش اور ترتیب میں وہ محنت و مشقت استعمال کریں پھر بھی اگر کسی نئے استخراج ہی کی ضرورت داعی ہو تو یہ جزئیات سابقہ ہی اس کا راستہ بہتر طریق پر ہموار کر سکیں گی۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ جب یہ فقہی جزئیات کا ذخیرہ اصول سے جڑا ہوا سامنے آئے تو شاید ہمیں کسی نئے جزیہ کے استخراج کی ضرورت ہی نہ پیش آئے کیونکہ معلوم ہو چکا ہے کہ فقہاء امت نے اصول فقہ اور قواعد شرعیہ کی روشنی میں بعید سے بعید محتملات تک کے احکام مستنبط کر کے جمع کر دیے ہیں جس کے مجموعہ سے ایک مستقل فن بنام فقہ تیار ہو گیا۔ جس میں ہر شعبہ زندگی کی بے شمار جزئیات موجود ہیں۔

اس لیے فکر جدید کی تشکیل میں قواعد کلیہ کے ساتھ ان جزئیات کو سامنے رکھنا از بس ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین نے کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے جزیہ کو بھی کسی مرعوبیت یا اقوام کے طعن و استہزاء کی وجہ سے کبھی ترک کرنا گوارہ نہیں کیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ ایک بار بغداد (عراق) میں کھانا تناول فرما رہے تھے ایک فارسی غلام کھانا کھا رہا تھا کہ ان کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے اسے فوراً اٹھا کر اس کی گرد جھاڑی صاف کیا اور تناول فرما لیا غلام نے عرض کیا کہ یہ ملک متمولوں دولتمندوں اور امیر چشموں کا ہے وہ اس حرکت کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھیں گے فرمایا:

أَأَتْرُكُ سُنَّةَ حَبِيبِي لِهٰؤُلَاءِ الْحُمَقَاءِ؟

کیا میں اپنے حبیب پاک کی سنت ان احمقوں کی وجہ سے ترک کر دوں؟

غور کیا جائے کہ ایک طرف تو دین کے ایک ایک جزیہ کی پابندی اور دوسری طرف ملکوں کی فتوحات، خلافت کی توسیع اور تسخیر اقالیم اور اس کے ساتھ سینکڑوں کا تمدن وطن، لیکن چونکہ ان پاک ارواح میں فیضان نبوت سے پیوست تھا وہ اس قسم کے عوارض سے کبھی ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ آخر صحابہؓ سے زیادہ کون سنن دین کی جزوی جزوی پابندیوں میں پیش قدم تھا مگر ان سے زیادہ عبقری کون اسلامی فتوحات میں تیز قدم تھا جس سے ایک طرف تو یہ واضح ہے کہ وقتی احوال و حوادث کے پیش نظر توسیع اور ہمہ گیری کے معنی ذہنی ڈھیلے پن کے نہیں کہ قوموں کی رضا جوئی یا مجبوری یا آج کل کی اصطلاحی رواداری کے تحت اسلامی جزئیات میں مداہنت کی جا سکے بلکہ یہ معنی ہیں کہ اسلام نے اصول اس درجہ وسیع اور لچک دار رکھے ہیں کہ حوادث ان سے باہر نہیں جا سکتے جس کے معنی یہ ہیں کہ دین اپنے خاص مزاج اور اساسی پالیسی کے تحت نہ حوادث میں کبھی تہی داماں ثابت ہوا اور نہ اس نے کہیں اپنے اندر خلا محسوس کر کے سپر ڈالی۔ دوسری بات بھی اسی واقعے سے اور اس جیسے ہزاروں واقعات سے نمایاں ہے کہ اسلام روکھی اور سوکھی قسم کا کوئی رسمی قانون نہیں بلکہ دین ہے جس کی اساس کا بنیادی عنصر عشق و محبت ہے جو ذات حق، ذات نبویؐ اور ذات صحابہؓ سے وابستہ ہے۔ اس لیے ایک سچا عاشق اپنے محبوب کی کسی ادا کو ایک آن کے لیے بھی نظر انداز نہیں کر سکتا جیسا کہ حضرت سلمان فارسیؓ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے یہاں حبیبی کا لفظ استعمال فرما کر اس محبت کی طرف اشارہ فرما دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی جزئیے کے ترک کرنے میں کوئی قانونی گنجائش بھی نکلتی ہو تو قانونِ عشق میں ایسی گنجائش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لیے اسلامی مزاج میں یہ عشقی کیفیات بھی اسی طرح گھلی ہوئی ہیں جیسے پانی میں شکر گھل جاتی ہے۔ جو ایک راسخ العقیدہ مسلم کو ہر ہر جزیہ کا پابند کیے رہتی ہے اور اس سے ایک اینچ بھی نہیں ہل سکتا۔ اسی لیے تشکیل نو کے وقت اسلام کی اس خصوصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام میں آزادئ ضمیر اور حریت رائے کی حدود

لیکن اس انتہائی پابندی اور قید و بند کے ساتھ ہی آزادئ ضمیر اور حریت رائے بھی پوری فراخی کے ساتھ اسلام نے قوم کو بخشی ہے کہ ایک عامی سے عامی آدمی بھی اسی قانونِ حق کے معیار سے مسلمانوں کے بڑے بڑے سربراہ پر روک ٹوک عائد کر سکتا ہے اور اسے عوام کی تنقید کو ماننے سے چارہ کار نہیں ہوتا۔ اس کے لیے سب سے بڑی نظیر نماز کی جماعت ہے جس کا نام امامت صغریٰ ہے، جو کلیتہً امامت کبریٰ یعنی امامت و خلافت پر منطبق ہے، وہاں اگر امام، اور امیر ہے تو یہاں بھی امام ہے۔ وہاں اگر جہاد میں ہر نقل و حرکت پر نعرۂ تکبیر ہے تو یہاں بھی ہے، وہاں اگر امام کے حق میں سمع و طاعت فرض ہے تو یہاں بھی ہے۔ وہاں اگر میمنہ اور میسرہ ہے تو یہاں بھی ہے، وہاں اگر صفوف میں شگاف آجانا ناکامی کی علامت ہے تو یہاں بھی ہے وغیرہ وغیرہ اس لیے امامت صغریٰ (جماعت صلوٰۃ) کے جو طور طریق رکھے گئے ہیں وہی تو عملی طور پر امامت کبریٰ اور اسٹیٹ میں بھی ہیں۔ اسی صورت حال کے تحت دیکھا جائے تو نماز کے مقتدی اس سے ذرا بھی منحرف ہو تو اس کی نماز ہی صحیح نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ

اس مسجد کی امارت اور اسٹیٹ میں مقتدیوں پر فرض ہے کہ جب امام نیت باندھے تو مقتدی بھی ساتھ ساتھ نیت کر کے ہاتھ باندھیں، وہ قیام میں ہو تو یہ بھی قیام کریں، وہ رکوع کرے تو یہ بھی رکوع کریں، وہ سجدہ میں جائے تو یہ بھی سربسجود ہو جائیں وہ ولا الضالین کہے تو یہ آمین کہیں، حتیٰ کہ اگر امام سے سہواً کوئی جزوی غلطی بھی ہو جائے اور وہ سجدہ سہو کرے تو مقتدی بھی اس کی اس فکری خطا میں ساتھ دیں اور سجدۂ سہو کریں۔

لیکن حریت و آزادی یہ ہے کہ اگر امام قرأت یا افعال صلوٰۃ میں کوئی ادنیٰ سی بھی غلطی کر جائے تو ہر مقتدی کو نہ صرف ٹوک دینے کا حق ہے بلکہ مقتدی اس وقت تک امام کو چلنے نہیں دے سکتے جب تک وہ اپنی غلطی کی اصلاح نہ کرے یا قرأت صحیح نہ کرے یا کسی رکن میں غلطی ہو جائے اور اسے درست نہ کرے، چنانچہ امام کی غلطی پر ہر ایک مقتدی پیچھے سے تکبیر و تسبیح کی آوازوں سے اس طرح متنبہ کرتا ہے اور کرنے کا حق رکھتا ہے کہ امام غلطی کی اصلاح پر مجبور ہو جائے۔

بعینہٖ یہی صورت امامت کبریٰ یعنی اسٹیٹ اور ریاست کی بھی ہے کہ امیر المومنین کی سمع و طاعت تو ہر حال میں واجب ہے ورنہ تعزیر و سزا کا مستحق ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی خود امیر کی کسی خطاء و لغزش پر ایک عامی سے عامی آدمی بھی برملا روک ٹوک کرنے کا حق رکھتا ہے۔ جب تک کہ امیر اس فعل کی اصلاح نہ کرے یا اس کا کوئی عذر سامنے نہ رکھے۔

فاروق اعظمؓ پر ایک اعرابی نے اس وقت اعتراض کیا جب کہ وہ بحیثیت امیر المومنین منبر پر کھڑے۔۔۔ ہو کر خطبے میں اعلان فرما رہے تھے کہ "لوگو! امیر کی بات سنو اور اطاعت کرو"۔ اعرابی نے کہا کہ ہم نہ بات سنیں گے نہ اطاعت کریں گے۔ فرمایا کیوں؟ کہا مال غنیمت میں آپ کا حصہ عام لوگوں کی طرح صرف ایک چادر تھی، حالانکہ آپ کے بدن پر اس وقت دو چادریں پڑی ہوئی ہیں۔ فرمایا اس کا جواب میرا بیٹا عبداللہ بن عمرؓ دے گا۔ صاحبزادہ نے فرمایا کہ امیر المومنین کا قد لانبا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا، ایک چادر کافی نہ تھی اس لیے بیٹے نے اپنی چادر پیش کر دی اور یہی ان کے بدن پر ہے جو انہوں نے آج استعمال کی ہے تب اعرابی نے کہا کہ اب ہم بات سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے — بہر حال منہاج نبوت کی مزاج کی رُو سے عمل میں تو یہ تقلید اور پابندی ہے کہ اس کے کسی کلیہ جزیہ میں ردوبدل بھی گوارا نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ ایک عامی آدمی کو بھی امیر المومنین تک پر کسی مخصوص قسم کی فروگذاشت کے بارے میں اعتراض کا حق دیا گیا۔ لیکن حریت رائے اور اصول کے تحت آزادی بھی انتہائی ہے جو حقیقی قسم کی جمہوریت کی پردہ دار ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اصول و قوانین کی یہ پابندی اور ان میں زندگی کو مقید کر دینا کوئی قید و بند نہیں جو ذہنوں پر شاق ہو، جب کہ ان ہی اصولوں کی پابندی سے اسلام اقوام عالمگیر بنی۔

اسلام اور اسلامی اصول کی عالمگیری
پر واقعاتی حقیقت کے شواہد

آخر جب ہم اسلام کے حق میں ایک عالمگیر دین کے مدعی ہیں تو اس ہمہ گیری کے معنیٰ ان کے اپنی اصولوں کی ہمہ گیری کے تو ہیں، اگر وہ تنگ اور جامد ہوتے تو اسلام عالمگیر تو کیا عرب گیر بھی نہ ہو سکتا، لیکن جب اپنی اصول پر صدیوں ہمہ گیر حکومتیں بھی چلیں اور اپنی اصول سے تربیت پا کر قوم میں عظیم شخصیتیں بھی ابھریں جنہوں نے مشرق و مغرب کو روشنی دکھائی اور ظلمتوں کی تنگنائیوں میں پھنسی ہوئی قوموں، انسانوں اور وطنوں کو ان کی مصنوعی حد بندیوں سے نکال کر انسانیت کے وسیع میدانوں میں پہنچایا تو کیا یہ اصول کی تنگیوں سے ممکن تھا...

اس لیے فطری اصول اور فطرت کی پابندی کو قید و بند اور تنگی سمجھا جانا ذہنوں کی تنگی کی علامت ہو سکتا ہے۔ فطرت کی تنگی نہیں کہلایا جاسکتا — بالخصوص جب کہ ان اصولوں کی دستوں میں ایسی گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ ان [illegible]

دَور کے مفکر اور اہل علم و فضل نے استخراج مسائل کی حد تک بھی کام لیا ہے اور آج بھی لے سکتے ہیں۔ جن میں ہر دور کے حوادث کے لیے ہدایت کا سامان موجود ہے۔

اس لیے تمدن و معاشرت کی مشخص عملی جزئیات اور سنن زائدہ پر اس قانون فطرت نے زیادہ زور نہیں دیا بلکہ اس کو وقت اور زمانے کے حوالے کر دیا ہے ہر زمانے میں جو نئی نئی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ انہیں اہل علم ان کے اصول سے وابستہ کر کے اُن کے احکام نکال سکتے ہیں، جیسا کہ مفکران ان باب فتوحٰی کا اسوہ اس بارے میں سامنے ہے.....

بالخصوص مسائل کے طرز استدلال کے بارے میں تو خاص طور پر ہر قرن جدید کے رنگ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ایک دور میں نظری فلسفہ نے رنگ جمایا اور دین کے بارے میں محض نقل و روایت لوگوں کے لیے تسلی بخش نہ رہی جب تک وہ عقل چوکے میں نہ آئے تو رازیؒ و غزالیؒ جیسے حکمائے ملت نے دین کو فلسفیانہ انداز میں پیش کر کے لوگوں پر حجت تمام کی ایک دَور میں تصوف اور حقائق پسندی کا غلبہ ہوا تو ابن عربیؒ وغیرہ نے صوفیانہ اور عارفانہ انداز سے اسلام کو نمایاں کیا۔ ایک دَور میں معاشی فلسفہ کا زور رہا تو شاہ ولی اللہؒ جیسے حکیم اُمت نے نظری و معاشی رنگ کے فلسفیانہ دلائل سے اسلام کو سمجھایا، اور وقت کے مسائل حل کیے۔ ایک دَور سائنس اور مشاہداتی فلسفے کا آیا تو بانی دار العلوم (دیوبند) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جیسے محقق اور عارف باللہ نے اسلامی عقائد و اصول کو شہوداتی رنگ میں حسی شواہد و نظائر پیش کر کے اتمام حجت فرما دیا۔ جس سے ایک طرف اسلام کی ہمہ گیری اور جامعیت واضح ہوئی تو دوسری طرف اس کا توسع کھلا اور اس کے رنگ استدلال کی یہ لچک بھی واضح ہوئی کہ اس کے حقائق پر ہر نوع دلائل کا لباس سج جاتا ہے اور حقیقت بدستور حقیقت رہتی [illegible] کہ خود اس میں یہ سارے الوان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور سارے نیج موجود ہیں جس سے ہر رنگ کا لباس زیب زدہ ثابت ہو جاتا ہے جو حقیقت خود اس کا رنگ ہوتا ہے البتہ حالات اور وقت کے تقاضے صرف اجاگر کر دیتے ہیں۔

دو ترقی تو آج بھی وہ ایسی ہی مثالی قوت و شوکت دکھا سکتی تھی جواب سے پہلے دکھلا چکی ہے اور دنیا اس کی تقلید پر مجبور رہتی ، نہ کہ قصہ برعکس ہو جاتا۔

دورِ جدید کی عملی و نظریاتی خصوصیات اور اسلامی قوت و شوکت

آج کا دور سیاسی اور معاشی اور مختلف نظریات کی سیاستوں اور معاشی فلسفوں کے غلبہ کا ہے ، مذہب بن رہے ہیں تو سیاسی معاشی پارٹیاں بن رہی ہیں تو سیاسی مسائل پیدا ہو رہے ہیں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ان حالات میں جب تک کسی دینی مسئلے کو سیاسی چاشنی کے ساتھ پیش نہ کیا جائے عوام کے لیے قابل التفات نہیں ہوتا ۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے اسلام کو سیاسی اور معاشی رنگ کے دلائل سے پیش کیا جائے یہ سیاسی رنگ اسلام کے حق میں کوئی بیرونی رنگ نہ ہوگا ۔ بلکہ اسی کے اندر کا ہوگا ۔ حالات متحرک ہوں گے اور ان کے فطری اور طبعی قسم کے معاشی اور سیاسی پہلو اس تحریک سے نمایاں ہو کر اسلام ہی کی سیاست و اجتماعیت کے اصول و قوانین نہ ہوتے تو صدیوں تک اس کی وہ مثالی حکومتیں دنیا میں نہ چل سکتیں ، جنہوں نے دین و دنیا کے ساتھ سیاسی حکمرانی کے فرائض بھی انجام دیئے ۔ آج بھی مسلم حکمرانوں کی بود و نمود اسی دور کی مستحکم فرمانروائیوں کے ثمرات ہیں جن میں کتاب و سنت اور تفقہ فی الدین کے انوار شامل تھے ، البتہ آج کے غالب یا مغلوب مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے موجودہ دور کے حکومتوں کے نظریات تو اختیار کر لیے لیکن ان کے عملی کارناموں سے کوئی سبق نہیں لیا اگر قوم اپنے نظریات قائم رکھ کر آج کے عمل میدانوں میں

دورِ جدید میں دینی مزاج کے مطابق فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کا واحد طریق عمل

بہر حال اس دور میں اس کی شدید ضرورت ہے کہ اسلامی اصول ، اسلامی مزاج اور رسوخ کا منہاج بجنسہ قائم رکھ کر جس میں دیانت و سیاست اور عبادت و مدنیت بیک وقت جمع ہے ۔ وقت کے مسائل کو نئی تشکیل و ترتیب سے نمایاں کر کے نئے حوادث میں قوم کی مشکلات کا حل پیش کیا جائے تو یہ وقت کے تقاضوں کی تکمیل ہو گی جب کہ اس میں فقیہ المزاج شخصیات ، اسلامی اصول کی روشنی اور جزئیات عملیہ کی رعایت اسلامی مزاج کی برقراری ، سلف صالحین کا اسوہ ، مرادات خداوندی کے ساتھ تفقیہ ، رضاء حق کی پاسداری ، اجتماعی اصلاح و فلاح ، اخروی نجات کا فکر وغیرہ کی حدود قائم رکھی جائیں گی تو بلاشبہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید دینی ہی رنگ کے ساتھ منظر عام پر آجائے گی مگر اسی کے ساتھ ان منتخب شخصیات میں جہاں اس دینی فکر اور تفقہ مزاجی کی ضرورت ہے جس کی تفصیل عرض کی گئی ۔ وہیں اس کی بھی شدید ضرورت ہے کہ وہ موجودہ دنیا کے مزاج اور وقت کو بھی پہچانتے ہوں ۔ عصری حالات اور وقت کی ضرورت بھی ان کے سامنے ہو ، علوم عصریہ میں انہیں مہارت و حذاقت میسر ہو ، دنیا کی عام رفتار اور آج کے ذہن کو بھی وہ سمجھے ہوئے ہوں اور اس میں ذی فہم اور ذی رائے بھی ہوں ، کیونکہ حالات ہی آلِ محرک نہ ہوں گے اگر یہ منتخب شخصیات عصریات کی خوگر ہوں لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عصریات سے بے خبر ہوں یا برعکس معاملہ ہو تو فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں کٹھن مرحلہ ایسی جامع شخصیتوں کی فراہمی کا ہے جو شرعیات اور عصریات میں یکساں حذاقت و مہارت کی حامل ہوں، عموماً اور اکثر و بیشتر ماہرین شرعیات عصریات سے کچھ نابلد اور موجودہ دنیا کی ذہنی رفتار اور اس کے گوناں گوں تغیرات سے بے خبر ہیں اور ماہرین عصریات اکثر و بیشتر شرعیات سے ناآشنا ہیں۔ اس لیے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا بار اگر تنہا ایک طبقے پر ڈال دیا جائے تو علماء کی حد تک بلاشبہ مسائل کی تشکیل قابل وثوق ہوگی لیکن ممکن ہے جدید طبقے کے اعتراضات کا ہدف بن جائے گی۔ اور دوسری طرف ماہرین عصریات جب کہ عامۃً دینی مقاصد اور اسلام کے شرعی موقفوں کا زیادہ علم نہیں رکھتے اور قوم کے دینی مزاج سے کچھ بیگانہ بھی ہیں۔ اگر فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا بار محض انہیں کے کندھوں پر ڈال دیا جائے تو حوادث کی حد تک وہ ماہرین شریعت کے اعتراضات کا ہدف بن جائے گی۔ بہر دو صورت تشکیل جدید کا خاکہ نا تمام بلکہ ایک حد تک نقصان دہ ثابت ہوگا۔

ان حالات میں درمیانی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ اس تشکیل کے لیے دونوں طبقوں کے مفکرین کی مشترک مگر مختصر اور جامع کمیٹی بنائی جائے جس میں یہ دونوں طبقے اسلام کے تمام تمدنی، معاشرتی اور سیاسی مسائل میں اپنے اپنے علوم کے دائرے میں غور و فکر اور باہمی بحث و تمحیص سے کسی فکر واحد پر پہنچنے کی سعی فرمائیں اور جامع فکر وہاں کو کتاب و سنت اور فقہ کی روشنی میں مسائل کی تنقیح میں استعمال کریں تو وہ فکر یقیناً جامعیت لیے ہوئے ہوگا۔ جس میں دینی ذوق اور شرعی دستور بھی قائم رہے گا۔ اور عصری حالات سے باہر بھی نہ ہوگا۔ نیز ایک طبقہ کا ہدف طعن و ملامت نہ بن سکے گا اور مسائل کے بارے میں کوئی خلجان و تشویش [illegible]

تشکیل جدید کرنے والے مفکرین کے لیے ایک امر لازم

البتہ مفکرین کو یہ ضرور پیش نظر رکھنا ہوگا کہ اسلام کوئی رسمی اور دنیوی قانون نہیں بلکہ دین ہے جس میں دنیا کے ساتھ آخرت بھی لگی ہوئی ہے۔ اور ہر عمل میں خواہ وہ فکری ہو یا عملی، جہاں انسان کی دنیوی زندگی میں شائستگی کی رعایت رکھی گئی ہے، اور انہیں تنگی اور ضیق و حرج سے بچا کر ہمہ گیر سہولتیں دی گئی ہیں۔ وہیں رضاء خداوندی اور آخرت کی جوابدہی بھی ان پر عائد کی گئی ہے۔ اس لیے اسے محض دنیوی قوانین اور صرف معاشی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر حوادث کا آلۂ کار بھی نہیں بننے دیا گیا ہے، کیونکہ احوال ہمیشہ بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے، حال کے معنی ہی مَا حَالَ فَقَدْ زَالَ کے ہیں (یعنی جو حال آیا وہ زائل بھی ہوگا) پس حال تو بدلنے ہی کے لیے بنایا گیا ہے۔ لیکن اصول فطرت بدلنے کے لیے نہیں لائے گئے ہیں، وہ اپنی جگہ اٹل ہی رہیں گے البتہ ان شرعی اصولوں میں ایسی وسعتیں ضرور رکھی گئی ہیں کہ وہ ہر بدلتی ہوئی حالت میں وقت کے مناسب رہنمائی کر سکیں، اس لیے مفکر کا کام صرف اتنا ہی ہوگا کہ بدلے ہوئے حالات اور نئے حوادث کو سامنے رکھ کر ان جزئیات مسائل کو سامنے رکھ کر ان جزئیات مسائل کو سامنے لے آئے جو اس حادثہ کے بارے میں منہاج نبوت نے اصولاً یا جزءاً وضع کیے ہیں اور ان پر منطبق کیے ہیں، پس مفکر، دانشور یا مبصر محقق کا کام حادثہ اور مسئلہ تبدیل کرنا نہیں بلکہ دونوں میں تطبیق دے دینا ہے، نہ حالات سے صرف نظر کرنا ہے نہ مسائل سے قطع نظر کر لینا ہے۔ اس لیے شریعت نے تمدنی اور معاشرتی احوال کی حد تک زیادہ تر قواعد کلیہ ہی سامنے رکھے ہیں۔ نئی جزئی صورتوں کی تخصیص نہیں کی ہے کہ [illegible] ہر دور میں نئے نئے رنگ میں کلیاں پھوٹتی رہی ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سیاسی "ملل و نحل" کی تدوین کی ضرورت و اہمیت

فی زمانہ اسلامی مسائل میں انتشار یا ان کے بارے میں شکوک و شبہات کی بوچھاڑ کا سرچشمہ سب جانتے ہیں کہ مغربی تہذیب و تمدن اور اس سے زیادہ آج کے سیاسی نظریات دماغوں پر مذہب کے رنگ سے چھائے ہوئے ہیں۔ آج مسلک اور ازم بن رہے ہیں تو سیاسی اور معاشی 'پارٹیاں' بن رہی ہیں تو سیاسی اور معاشی قوانین تیار ہو رہے ہیں تو سیاسی اور معاشی حتیٰ کہ عقائد بن رہے ہیں تو وہ بھی سیاسی اور معاشی۔ چنانچہ سیاسی نظریات کے بارے میں اصطلاح بھی ٹھہر گئی ہے جو مذہب اور دین کے بارے میں رائج تھی کہ ہم فلاں نظریے پر یقین رکھتے ہیں یا بالفاظ دیگر ایمان لاتے ہیں جو کسی دور میں دینی عقائد کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ اسی لیے آج ایک سیاسی "ملل و نحل" کی تدوین کی بھی اشد ضرورت ہے جس میں سیاسی مذاہب کے عقائد و افکار کو تقابلی رنگ سے سامنے رکھ کر اسلام کے اجتماعی مسائل کو دلائل کی روشنی میں پیش کیا جائے جس کے لیے چند مفکر عالم اور چند منطق گو [illegible] کی خدمات حاصل کی جائیں کیونکہ قدیم زمانے کے "ملل و نحل" اس دور کے پیدا شدہ مذہبی عقائد اور افکار کے پیشِ نظر مرتب ہوئے تھے جبکہ دوروں پر سیاست کے ٹھپے لگے ہوئے نہیں تھے۔ اب عصرِ حاضر کے سیاسی عقائد و افکار کو سامنے رکھ کر اسلام کے سیاسی اجتماعی اور معاشرتی مسائل کو دلائل و شواہد سے سامنے لانے کی ضرورت ہے۔

خوشی ہے کہ جامعہ اسلامیہ نے آج جب فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو کا سلسلہ اٹھایا تو ممکن ہے کہ سیمینار کے ثمرے کے طور پر اسی سیاسی، معاشرتی اور اجتماعی رنگ کی "ملل و نحل" کی مضبوط بنیاد بھی پڑ جائے۔ حدیث اور فقہی کتب میں معاشرتی تمدنی اور اجتماعی مسائل کی جزئیات ابواب و فصول کے ساتھ جن جن عنوانات سے پائی جاتی ہیں وہ اپنی جامعیت اور اصولیت کی وجہ سے اپنے متعلقہ مسائل کی جزئیات پر کلیتہً حاوی ہیں اور ان میں فقہائے امت کے دل و دماغ کا نچوڑ سمایا ہوا ہے۔ اسی لیے اگر ان عنوانات کے تحت کام کیا جائے اور آج کے معاشرتی، سیاسی اور تمدنی مسائل کو تقابلی انداز سے سامنے رکھ کر علمی اور فکری سعی کا محور بنا لیا جائے تو اس میں تمام وقتی مسائل بھی آ جائیں گے اور دوسرے اہم مسائل بھی شامل ہو جانے کی وجہ سے ایک بہترین سیاسی "ملل و نحل" تیار ہو جائے گی جو جامعہ کا ایک یادگار کارنامہ ہوگا۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی توقع رکھنی چاہیے کہ یہ سعی چند زبان زد مسائل مثلاً بینک کاری، اسٹاک ایکسچینج و سودی معاملات یا انشورنس وغیرہ وغیرہ جیسے مالی اور تجارتی مسائل تک ہی محدود نہ رکھی جائے گی کیونکہ جب فکرِ اسلامی کے بارے میں قدم اٹھایا جا رہا ہے تو وہ بھرپور اٹھنا چاہیے جس میں اس قسم کے تمام مسائل کا ایک ہی بار فیصلہ کر دیا جائے۔

امید ہے کہ اس تشکیل کے سامنے آ جانے پر یہ شبہ بھی حل ہو جائے گا کہ آیا اسلام ہی جمود ہے یا ذہنوں میں جمود ہے جسے اسلام کی طرف منسوب کر دیا ہے حالانکہ اسے توڑنے والا خود اسلام ہے جبکہ اس نے تیرہ صدیوں میں کتنے ہی جامد ذہن اقوام کا جمود توڑا ہے۔ اسلام نے اپنے اصولِ فطرت میں ماننے والوں کو محدود کر دیا ہے جس کے معنی جمود کے سمجھے جا رہے ہیں لیکن اصولِ فطرت میں محدود رہنا جمود نہیں بلکہ جمود شکنی ہے۔

اسلامی مزاج اور منہاجِ نبوت کے اساسی اصول

منفی پہلو:

(۱) لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ

اسلام بغیر جماعت نہیں یعنی اسلام کا مزاج اجتماعیت پسند[20] ہے انفرادیت پسند نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۲) لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ۔

یعنی دین کے بارے میں اسلام کا مزاج اختراع پسندی اور جدت طرازی کا نہیں بلکہ اتباع پسندی ہے نیز گوشہ گیری اور انقطاعیت پسندی کا نہیں بلکہ عام مخلوق میں ملے جلے رہ کر کام انجام دینے کا ہے۔

(۳) لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ

یعنی اسلام کا مزاج دین میں جبر و اکراہ اور تشدد کا نہیں بلکہ نرمی و محبت کے ساتھ حجت و برہان سے حق واضح کر دینے کا ہے۔ ماننا نہ ماننا مخاطب کا اختیاری فعل ہے۔

(۴) لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ فِي الْإِسْلَامِ

یعنی اسلام کا مزاج تخریبی یا ضرر رسانی کا نہیں بلکہ تعمیری اور نفع رسانی کا ہے۔

(۵) لَا عَدْوَىٰ وَلَا طِيَرَةَ فِي الْإِسْلَامِ

یعنی اسلام کا مزاج توہم پسندانہ نہیں کہ شگون یا ٹونے ٹوٹکے یا کسی کی بیماری کسی کو لگ جانے کا تخیل باندھ لیا۔ اس کے یہاں معتبر ہوں بلکہ حقیقت پسندانہ ہے کہ امور واقعیہ ہی اس کے نزدیک معتبر ہوتے ہیں۔ خواہ وہ حسی اسباب سے ظہور پذیر ہوں یا معنوی اسباب سے تخیلاتی اور توہماتی خطرات و وساوس اس کے نزدیک اسباب نہیں ہیں کہ حوادث کا ان سے تعلق ہو۔

(۶) لَا نُوَلِّي أَمْرَنَا هٰذَا مَنْ طَلَبَهُ

یعنی اسلام کا مزاج طالب عہدے کو عہدہ نہ دینے کا ہے۔ گویا عہدوں کی طلب خودغرضی کی دلیل ہوتی ہے اور خودغرض انسان اپنی اغراض کی تکمیل میں مشغول رہ کر فرائض منصبی میں عادۃً قاصر رہتا ہے۔

(۷) لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا۔

یعنی اسلام کا مزاج کسی پر اس کی طاقت کے قدر بار ڈالنے کا ہے خواہ انسان ہو یا حیوان زائد از طاقت بوجھ رکھنا اس کے نزدیک ظلم ہے۔

(۸) لَيْسَ مِنَّا مَنْ غَشَّنَا

یعنی اسلام کا مزاج گندم نما جوفروشی اور نمائشی خوبصورتیاں دکھلا کر دغل فصل کا نہیں بلکہ حقیقت پسندی اور حقیقت نمائی کا ہے۔

(۹) وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ۔

یعنی اسلام کا مزاج تصنع، بناوٹ یا نمائش پسندی کا نہیں بلکہ سادگی سچائی اور ظاہر و باطن کی یکسانی کا ہے۔

(۱۰) لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ

یعنی اسلام کا مزاج شخصیات مقدسہ کے نام پر تعصب تنگی، حدبندی اور گروہ سازی کا نہیں بلکہ ان کی ہمہ گیر توقیر و تعظیم کے ساتھ بین الاقوامی طور پر اقوام کو ایک پلیٹ فارم پر لانے اور عالم انسانیت کو متحد کرنے کا ہے۔

(۱۱) لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ۔

یعنی اسلام کا مزاج دل چھوڑ کر بیٹھ رہنے اور بزدلی اور کم ہمتی دکھلانے کا نہیں بلکہ عزیمت اور قوت یقین کے ساتھ عالی حوصلگی اور ہیبت مردانہ دکھلانے کا ہے۔

(۱۲) لَا تَيْأَسُوا مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ

یعنی اسلام کا مزاج کتنی بھی مشکلات کا ہجوم سر پر آ جائے مایوسی کا نہیں بلکہ امید بھروسہ اور اللہ پر اعتماد کے ساتھ ثبات و استقلال اور آگے بڑھتے رہنے کا ہے۔ مایوسی اس کے نزدیک کفر کا شعبہ ہے۔

(۱۳) مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ

اسلام کا مزاج دین کے بارے میں تنگی اور تنگی کا نہیں بلکہ فراخی کا ہے۔ معذور کو مجبور نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے مناسب حال راہ نکال دی جاتی ہے۔

لَنْ يُشَادَّ الدِّينَ إِلَّا غَلَبَهُ

یعنی اسلام کا مزاج دین میں غلو، مبالغہ اور تحمل بیجا کا نہیں ورنہ دین اسے ہٹا دے گا بلکہ اعتدال کے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بقدر طاقت بوجھ اٹھانے کا ہے۔ توسط و اقتصاد ہی اس کا بنیادی اصول ہے۔

(۵) لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔

یعنی اسلام کا مزاج دوست اور دشمن میں یکساں انصاف ہے۔ جانبداری یا بے جا رعایت یا خویش نوازی اس کے یہاں خلافِ عدل اور خلافِ تقویٰ ہے۔

(۱۶) لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔

یعنی اسلام کا مزاج عمل پر ابھارنا ہے کہ ہر ایک کو اسی کی سعی کام دے گی۔ دوسرے کی محنت کام نہ آئے گی تاکہ آدمی دوسروں پر تکیہ کر کے معطل نہ ہو بیٹھے ہمت سے خود آگے بڑھے۔

مثبت پہلو

یہی صورت اسلام کے اساسی اصول میں مثبت ضابطوں کی بھی ہے جس سے اسلام کا مزاج کھلتا ہے۔ مثلاً

(۱) لِیَھْلِکَ مَنْ ھَلَکَ عَنْ بَیِّنَۃٍ وَّیَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْ بَیِّنَۃٍ

یعنی اسلام کا مزاج حجت پسندی، حجۃ طلبی اور تحقیقِ حال کا ہے۔ جذبات پسندی یا محض شبہات یا قرائن بے تحقیق کسی کو انعام یا انتقام دینے کا نہیں۔

(۲) وَالصُّلْحُ خَیْرٌ وَّاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ

یعنی اسلام کا مزاج صلح جوئی اور امن پسندی کا ہے۔ لڑائی جھگڑا، شر انگیزی اور فتنہ جوئی کا نہیں نیز اس کا مزاج احسان اور جود و کرم کا ہے۔ بخل، تنگی اور حرص رسی کا نہیں۔

(۳) وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔

یعنی اسلام کا مزاج انتقام پسندی نہیں بلکہ مصائب یا ایذا رسانیوں پر صبر و تحمل اور عفو و درگزر کا ہے۔ اسی کو اس نے اولوالعزمی کہا ہے۔

(۴) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ

یعنی اسلام کا مزاج باہمی بھائی بندی اور غمخواری کا ہے، اجنبیت پسندی اور بیگانہ روش کا نہیں۔

(۵) اِنَّ النَّاسَ کُلَّھُمْ اِخْوَۃٌ

یعنی اسلام کا مزاج عالمی بھائی چارے کا ہے کہ تمام انسان بھائیوں کی طرح رہیں خواہ کوئی بھی قوم ہو اور کسی بھی مذہب کی ماننے والا ہو۔ غلام سازی یا استحصالِ عوام یا گروہ سازی کے ذریعے بھائی کو بھائی سے جدا کر دینے کا نہیں ہے۔

(۶) مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا

یعنی اسلام کا مزاج پورے عالم انسانیت کے احترام و تحفظ ہے۔ انسانیت کی تحقیر و تذلیل اور اس پر دباؤ سے اس کے ضائع ہو جانے پر قناعت کر لینے کا نہیں۔

وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا

یعنی اسلام کا مزاج خلط و التباس یا حق و باطل کو مخلوط کر دینے یا اقوام کی رضا جوئی کی خاطر حق و باطل کو جمع کر کے بیچ بیچ راہیں نکالنے کا نہیں بلکہ حق و باطل کو نکھار کر متمیز کر دینے کا ہے۔

(۸) اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً

اسلام کا مزاج دائرہ حق (اسلام) میں پورے داخل کرانے اور یک رخی کے ساتھ دلوں کو سکون و اطمینان بخشنے کا ہے۔ نا تمام اور ادھورے کام سے دلوں کو ڈانواڈول کر دینے کا نہیں۔

(۹) اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا

یعنی اسلام کا مزاج امانت داری اور امانت سپاری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا ہے بددیانتی، خیانت پسندی یا دخل فعل کا نہیں۔

(۱۰) وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا

اسلام کا مزاج اجتماعی امور میں استواری نظام اور قیام امارت پر امیر کے حق میں سمع و طاعت کا ہے اگرچہ ایک حبشی غلام ہی امیر بنا دیا جائے۔ لامرکزیت یا قومیت اور بے مرکز جمہوریت اسلام کا مزاج نہیں کہ یہ انتشار پسندی ہے۔

(۱۱) كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ

اسلام کا مزاج ہر ایک کو اپنے ہی عمل پر ابھارتا ہے تاکہ دوسروں پر تکیہ کر کے نہ بیٹھ جائے۔

(۱۲) مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ کوئی اپنی نسبت یا نسب یا انتساب پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائے۔ جس نے جو کچھ کیا ہے وہ ضرور اس کے آگے آئے گا۔

(۱۳) ثَلٰثَةٌ أَبْغَضُهُمُ اللّٰهُ أَوْ مِنْهُمْ مُبْتَغٍ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةَ جَاهِلِيَّةٍ

یعنی اسلام کا مزاج یہ ہے کہ جاہلیت کی جن رسوم کو اس نے مٹا دیا ہے ان کا اعادہ یا نئی نئی پگڈنڈیاں نکالنا اس کے لیے قابلِ برداشت نہیں کہ یہ خود اسلام کی تخریب ہے۔

(۱۴) مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔

اسلام کا مزاج رسالت کی پیروی کرانا ہے۔ قانونِ حق میں ایجاد اختراع کرانا نہیں۔

(۱۵) اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ اور

إِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَإِنَّكُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ

اسلام کا مزاج ہر عمل کو خواہ عبادت ہو خواہ عادۃً، اخروی بنانا ہے دنیا پر ختم کر دینا نہیں ہے۔ وہ دنیوی منفعت کو اصل رکھتا ہے مگر دنیا ترک کرانا بھی نہیں بلکہ اسے اختیار کر کے اس میں سے آخرت نکلواتا ہے۔ اسی لیے دنیا کو کھیتی کہا ہے پس اگر پھل ضروری ہے تو کھیتی کرنی بھی ضروری ہے ورنہ پھل نہیں مل سکتا۔ پس اسلام کے مزاج میں ترکِ دنیا نہیں بلکہ ترکِ محبتِ دنیا ہے۔ اس لیے کہ یہ ساری دنیا انسان کے لیے پیدا کی گئی ہے تو وہ معطل نہیں چھوڑی جا سکتی اور انسان آخرت کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو اسے محض دنیا پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔

خلاصۂ اصول: بہرحال کتاب و سنت کے یہ چند اساسی اصول جیسے اجتماعی، انفرادی، شخصی، جماعتی مرکزیت، امارت، سمع و طاعت، تفویضِ عہدہ جات کی نوعیت، عوام کا طرزِ تربیت، اخلاق بلندی، عمل بخشش، معاشرت کا ڈھنگ، دین کی وسعت، خلق والفت سے اس کا بالاتر ہونا، بدعات و محدثات سے گریز، اتباعِ رسالت، اخوت، ہمدردی، بے لوث عدل و انصاف، خدمتِ خلق، دنیا کا آخرت سے ربط اور آخرت کی مقصودیت وہ امور ہیں جن سے منہاجِ نبوت کا ذوق اور اسلامی مزاج کھل کر سامنے آتا ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں جو سرسری طور پر ذہن میں آگئیں ورنہ کتاب و سنت ان جیسے سینکڑوں اصول سے بھری ہوئی ہیں۔ ہمیں اپنی تشکیلِ نو میں ان سب کو بہرحال سامنے رکھنا ہے۔

تشکیلِ جدید میں
سب سے زیادہ اہم قدم
رجالِ کار کا انتخاب

لیکن ان اقدامات میں سب سے زیادہ اہم قدم یا پہلا قدم رجالِ کار کا انتخاب ہے جو دین کی سمجھ اور فقیہانہ شان رکھتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی دین کے اصول و فروع ان کے سامنے ہوں اسلام کی حقیقی روح ان کی روحوں میں پیوست ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اسلام کی وہ حکمت عملی اگر رجالِ کار ناواقف یا غیر فقیہہ یا غیر مبصر اور اسلام کی حکمت عملی سے نابلد، مزاجِ اسلام سے بیگانہ ہوں تو فکرِ اسلامی کی تشکیل ممکن نہ ہوگی۔ اس لیے سب سے بڑا مسئلہ شخصیات کے انتخاب کا ہے۔ حق تعالیٰ نے جب اس عمل دین کو دنیا میں بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو اولاً شخصیت ہی کا انتخاب فرمایا اور وہ ذات تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جس کی وجہ یہ ہے کہ دین محض تعلیم و تعلم کے لیے نہیں بلکہ تربیت کے لیے آتا ہے اور تربیت محض تعلیم یا کتاب کے نوشتوں سے نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس سے ہم آہنگ شخصیتیں اسے قلوب تک پہنچانے والی اور اپنے عمل سے نمایاں کرنے والی نہ ہوں۔ اس لیے دنیا کا کوئی دور بھی ایسا نہیں گزرا کہ اقوام کی صلاح و فلاح کے لیے محض قانون اتارا گیا ہو اور پیغمبر کی شخصیت نہ بھیجی گئی ہو کیونکہ شخصیت ہی دین اور مسائل دین کو اس انداز اور اس حکمتِ عملی سے پیش کر سکتی ہے جو شارع حقیقی حق تعالیٰ شانہٗ نے اس کے لیے وضع کی ہے۔ اس لیے وہی شخصیت مخاطب قوم کی نفسیات کی رعایت رکھتی ہے اور اس کے اجتماعی مزاج سے آگاہ ہوتی ہے جو ہدایت کے لیے منتخب کی جاتی ہے کیونکہ ہر دور میں اسی رنگ کی شریعت آئی جو رنگ مخاطب قوم کا تھا اور اسی نوع کے معجزات سے نبوت کو ثابت کیا گیا جو نوعیت اس دور کے فنی مزاج کی ہوئی۔

آج جبکہ نبوت ختم ہو چکی ہے تو انبیاء کا کام اس امت کے مجددوں اور مفکر علماء عرفاء کے سپرد کیا گیا کہ وہ شریعت کو اسی رنگ سے ثابت کر کے دلا میں جائیں جو آج کے دور کی نفسیات کا رنگ ہو۔

اس حقیقت کو امام ابن سیرینؒ نے جو ایک جلیل القدر تابعی اور تعبیر خواب کے امام ہیں ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے کہ

إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ
تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ۔ (مشکوٰۃ)

یہ علم (اور آج کی اصطلاح میں [illegible] ہے تو دیکھو کہ کس (شخصیت) سے تم دین (یا فکر) اخذ کر رہے ہو۔

جس سے دین اور دینی فکر کے بارے میں ہمیں پوری رہنمائی ملتی ہے کہ تربیت کا سب سے بڑا ماخذ شخصیت ہے، کاغذ اور نوشتے نہیں ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مربی اور معلم یا مصلح فکر اگر خود صحیح المنہاج ہوگا تو وہی قلوب کی صحیح رہنمائی کر سکے گا ورنہ وہ خود اگر اس منہاج کا فکر لیے ہوئے نہ ہو یا قلب میں کوئی زیغ اور کجی لیے ہوئے ہو تو کتاب و سنت سے بھی وہ اسی زیغ ہی کو سامنے لا کر دوسرے قلوب میں بھرے گا۔

آخر مسلمانوں میں آج کتنے متضاد فرقے ہیں جو قرآن ہی کو اپنا امام تسلیم کرتے ہیں اور اسی کا نام لے کر اپنا اپنا فکر دنیا کے سامنے رکھتے ہیں درآں حالیکہ ان متضاد فرقوں میں کوئی ایک ہی حق و صواب پر ہو سکتا ہے، سب کے سب اس تضاد فکری کے ساتھ حق نہیں کہلائے جا سکتے۔ ظاہر ہے کہ کتاب و سنت کے سامنے ہونے اور اسے امام کہنے کے باوجود اگر کوئی فرقہ مبطل ہو سکتا ہے تو یہ اس کی واضح دلیل ہے کہ اس راستے میں فکر صحیح اور مفکر کی ذات ہی اصل ہے اور کسی فرقے کے مبطل ہونے کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ اس کے ہاتھ میں کتاب و سنت اور دینی لٹریچر نہیں بلکہ یہ ہوں گے کہ اس میں کوئی صحیح الفکر اور ذوق سلف پر تربیت یافتہ شخصیت نہیں بلکہ کوئی مبطل اور زیغ زدہ شخصیت آئی ہوئی ہے۔ بس اگر شخصیت صحیح ہو تو باطل نوشتوں سے بھی وہ حق ہی سامنے لے آئے گی اور اگر وہی فاسد الفکر ہو تو قرآن و حدیث سے بھی وہ باطل ہی نمایاں کر کے قلوب کو فاسد کر دے گی ورنہ قرآن کو امام کہنے والا کوئی مبطل فرقہ مبطل نہ ہوتا۔ اسی لیے جب کہ ہم فکر اسلامی کی تشکیل کے لیے قدم اٹھا رہے ہیں تو سب سے مقدم صحیح الفکر شخصیات ہی کا انتخاب ہے جس سے منہاج نبوت کا صحیح اور متوارث ذوق ہمارے سامنے آ جائے اور اسی سیدھے سے منہاج پر بیدار فکری اور تقاضات کے ساتھ رواں دواں ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حرفِ آخر

بہر حال فکرِ اسلامی کی تشکیل تو قابلِ تبریک ہے جسکا سہرا جامعہ ملیہ کے سر ہوگا لیکن اس میں سب سے پہلا قدم نشانۂ فکر تعین کرنا ہے اور وہ منہاج نبوۃ ہے۔ دوسرا قدم اس منہاج میں فکر دوڑانے کے لیے اس کے اصول و قواعد درکار ہوں گے جس میں قواعد کلیہ اور فروعات فقہیہ سب داخل ہیں۔ تیسرا قدم اس مزاج کا پہچاننا ہے اور اسے سامنے رکھنا ہے جو ملتِ اسلامیہ کو بخشا گیا ہے اور اس پر اس کی صدیوں سے تربیت ہوتی آرہی ہے۔ چوتھا قدم رجالِ فکر کا انتخاب ہے کہ فکر کا ظہور صاحبِ فکر ہی سے ہو سکتا ہے نہ کہ محض کاغذ کے نوشتوں سے اور پانچواں قدم ان ظاہری اور باطنی خصوصیات کی رعایت ہے جو اس منہاج کا جوہر اور اس کی خصوصیات ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ اجلاس جامعہ میں تو قلتِ وقت کی وجہ سے قرآنی اصول کی صرف اجمالی فہرست ہی پیش کر سکا تھا جو یقیناً تشنۂ تفصیل تھی اور اب مقالہ کی صورت میں اس کی کچھ توضیحات بھی اگر پیش کر رہا ہوں تو قلتِ فرصت کی وجہ سے وہ بھی کچھ تفصیل اور مرتب شدہ نہیں ہیں بلکہ کثرتِ مشاغل کے سبب بھاگ دوڑ کے ساتھ جو بھی منتشر چیزیں سامنے آرہی ہیں انہیں کو عجلت کے ساتھ جمع کر دیا گیا جس میں نہ کسی خاص ترتیب ہی کی رعایت ہو سکی ہے نہ نظامِ کلام کی۔ اس لیے اسے جُهْدُ الْمُقِلِّ دُمُوعُهٗ کے مصداق سمجھنا چاہیے، جو ادائے فرض تو ہے، مگر لازم فرض سے آراستہ نہیں ہے۔

دعا ہے کہ حق تعالیٰ اس مہم کو انجام حسن تک پہنچائے اور ملت کے لیے ایک نافع قدم ثابت فرمائے آمین۔

(ماخوذ ماہنامہ 'دارالعلوم' دیوبند (بھارت)
شمارہ جنوری فروری ۱۹۶۹ء)

ایک تبلیغی جماعت قطب الاقطاب حضرت اقدس شاہ عبدُ القادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں لاہور میں حاضر ہوئی اور درخواست دعا و توجہ کے لیے کی۔ حضرت رحمۃ اللہ نے خوب دعائیں کیں۔ پھر جماعت والوں نے کچھ نصیحت چاہی۔ اس پر حضرتِ اقدس نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و عمل کے مطابق کام کرو گے تو ہزاروں سال کے فتنے دنوں میں مٹ جائیں گے اور اگر خلاف کرو گے تو ہزاروں سال بعد کے فتنے دنوں میں ظاہر ہو جائیں گے۔

پھر حضرت نے فرمایا تبلیغ کا کام کرنے والوں کے لیے اولاً ذکرِ خدا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ جلّ شانہٗ نے منصب نبوت عطا فرمانے سے قبل غارِ حرا میں طویل عرصہ تک اپنا ذکر کرایا۔ پس معلوم ہوا ذکرِ خدا کے بعد ہی فکرِ رسولؐ پیدا ہو سکتا ہے یعنی دعوت کا کام کرنے والوں کے لیے خدا کا ذکر ناگزیر ہے۔

ایک مرتبہ عید کا دن تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جا رہے تھے۔ راہ میں کچھ بچے کھیل کود رہے تھے۔ ایک بچہ مغموم و افسردہ سب سے الگ تھلگ بیٹھا تھا اور کھیل میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا، کیا بات ہے؟ اس نے کہا میں یتیم ہوں۔ میری ماں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ کوئی نہیں جو میری سرپرستی کرے۔ آپؐ نے فرمایا۔ کیا تم اسے پسند نہیں کرتے کہ محمدؐ تمہارا باپ ہو، عائشہؓ تمہاری ماں ہو اور فاطمہؓ تمہاری بہن؟ بچہ خوش ہو گیا اور پھر وہ باپوں میں سب سے بہتر باپ، ماؤں میں سب سے بہتر ماں اور بہنوں میں سے سب سے افضل بہن کے دامنِ شفقت میں پہنچ گیا۔

© rasailojaraid.com